بدلتی دنیااور فکرِاقبال

CHANGING WORLD & IQBAL'S THOUGHT

حافظ محمد جنید رضا[1]، ڈاکٹر سعادت سعید[**]

Abstract:

The man of today is living in the age of global village and post nine eleven world. In this age, it is very laborious for nations to cope with terrorism. Today, each nation is drifting away from its culture and civilization. Peace and tolerance is necessary for the world, remain connected with one's culture and civilization is need of the hour.The solution to these problems lies in the philosophy of Iqbal. Only the study of Iqbal can bring us out of this tragic state of affairs. This can be made possible with the help of knowledge and art. When people come near to prose and poetry, they definitely would not go astray from their culture and civilization. If today's man makes the spirit of Ishq in the poetry of Iqbal a guiding star for himself so this can be helpful for him.Then, it would become clear that only the thought of Iqbal can meet the demands of the changing world.

Keywords: Peace, Civilization, Culture, Nine Eleven, Moulana Rumi, Welfare state, Freedom, Greatness of Man

ہر اہم تخلیقی ذہن اپنے دور کے حالات پر گہری نظر رکھتا ہے۔اس لیے اس کے عہد کے لوگ اس کی تخلیقات کو پڑھ کر شرفِ قبولیت بخشتے ہیں۔اردو اور فارسی ادب کی تاریخ کو پیشِ نظر رکھیں تو معلوم ہو گا کہ کچھ ایسے شعرا کرام جو کہ زمانی اعتبار سے دو سو یا تین سو سال پہلے کے ہیں لیکن آج بھی ان کی کتب شائع ہو رہی ہیں اور لوگ انھیں موجودہ عہد کے شعرا سے زیادہ پڑھ رہے ہیں۔شاعر کا مطالعہ اور تخلیقی تجربہ اس کے فن پاروں کو اہم بناتا ہے۔

انسانی تاریخ بتاتی ہے کہ ہر دور میں بنیادی انسانی مسائل ایک سے رہے ہیں۔جیسا کہ تعلیم اور روزگار کا حصول ہر عہد میں اہمیت کا حامل رہا۔ہر قوم اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنی دھرتی سے جڑت قائم رکھتی ہے لیکن جب دنیا کی حاوی تہذیبیں اپنی یلغار کرتی ہیں تو ہر قوم اپنی شناخت کھو دینے کے مسئلے کا شکار ہوتی ہے۔ایسے میں شاعر،ادیب بڑی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔کیوں کہ اپنی تہذیب و ثقافت کا پرچار کرتے ہوئے اپنی قومی شناخت قائم رکھنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

علامہ اقبال اپنے عہد میں بھی پڑھے جا رہے تھے اور آج بھی پڑھے جا رہے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے عہد کے کچھ مسائل ایسے تھے کہ جنھیں آج بھی نظر انداز کر دینا ممکن نہیں۔تہذیبوں کے تصادم کا مسئلہ جتنا اس دور میں اہم تھا شاید یہ مسئلہ آج اس سے زیادہ اہمیت اختیار کر چکا ہے۔اس وقت کا انسان بھی مشرقی تہذیب کے مٹنے کا نوحہ پڑھ رہا تھا اور مغربی تہذیبی یلغار سے بچنے کی تدبیر کر رہا تھا اور آج بھی حالات زیادہ مختلف نہیں۔دنیا میں امن قائم رکھنے کی بات اس وقت بھی کی جا رہی تھی اور آج بھی اسی پر مباحثے منعقد کیے جا رہے ہیں۔

---

[1] لیکچرار اُردو، ورکرز ویلفیئر کالج، ڈیفنس روڈ، لاہور

[**] شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

آج ہم گلوبل ولیج اور مابعد نائن الیون عہد میں جی رہے ہیں اور جدید سائنسی ترقی نے حیرت انگیز ایجادات سے انسانی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ انٹرنیٹ اور پھر فیس بک، واٹس ایپ جیسی ایجادات نے زندگی کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ ہر کوئی ان کو وقت دے رہا ہے اور اس میں مغربی کلچر کو بڑی شد و مد کے ساتھ دکھایا جا رہا ہے۔ کیوں کہ سیاسی طور پر حاوی کلچر اپنے مذہبی اور سیاسی نظریات کا خوب پرچار کرتا ہے۔

لوگ معیاری تعلیم اور باعزت روزگار کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ نوجوان عدم برداشت کا شکار ہیں اور دہشت گردی جیسے مسائل سے دوچار ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ان مسائل کا حل فکرِ اقبال میں موجود ہے۔ شعر و ادب انسان کو ذوقِ جمالیات عطا کرتا ہے۔ ان کے مطالعے سے انسان کے اندر ایک مہذب اور شائستہ رویہ پروان چڑھتا ہے۔ جب نوجوان علمی و ادبی مصروفیات میں وقت صرف کرے گا تو امید کی جا سکتی ہے کہ وہ عدم برداشت کے رویے سے محفوظ رہنے میں کامیاب رہے گا۔

کلامِ اقبال کی روح کو سمجھنا ضروری ہے۔ ان کے ہاں عشق کا تصور ایک انقلابی صورت میں سامنے آیا ہے۔ ان کے اس تصور کو ہی رہنما بنا لیا جائے تو موجودہ دور کے مسائل کا حل تلاش کرنے میں بڑی مدد مل جائے گی۔ وہ عشقِ رسول ﷺ سے سرشار تھے۔ ان کا سرچشمۂ فیض تو حجازِ مقدس ہے۔ وہ خاکِ مدینہ کو اپنی آنکھ کا سرمہ قرار دیتے ہیں:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف[1]

کبھی حب رسول ﷺ سے معمور ہو کر سرورِ کائنات سے خالص وفاداری کو دونوں جہان کی کامیابی و کامرانی سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں[2]

اس سلسلے میں اردو زبان و ادب کے معروف نقاد فرمان فتح پوری رقم کرتے ہیں:

''اقبال کے نظامِ فکر و فن میں عشق کو مرکزی اہمیت حاصل ہے، ایسی اہمیت جسے نظر انداز کر کے کوئی شخص ان کے فلسفہ حیات سے بہرہ مندی اور ان کی شاعری سے لطف اندوزی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔''[3]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری علامہ اقبال کے نظامِ فکر و فن پر بات کرتے ہوئے ان کے تصورِ عشق اہم قرار دے رہے ہیں۔ ان کے نزدیک اس تصور کو سمجھے بغیر کوئی بھی علامہ اقبال کو مکمل سمجھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ نہ ہی کوئی ان کی ادبی چاشنی سے محظوظ ہو سکتا ہے۔ ان کے دو شعر ان کے جذبہ عشق کو بہترین بیان کرتے ہیں:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی[4]

اسی طرح مزید کہتے ہیں:

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں[5]

اقبال کے مذکورہ بالا پہلے شعر میں عشق کی کارفرمائی کو بیان کیا گیا ہے کہ کیسے عشق کو عقل پر فوقیت حاصل ہے اور اس جذبے نے کیسے ناممکن کو ممکن بنا دیا ہے۔ دوسرے شعر کو دیکھا جائے تو اس میں انھوں نے عشق کی اک جست سے اس زمین و آسمان کو مسخر کرنے کی بات کی ہے

۔یہی وہ بنیادی جذبہ ہے جو انسان کو ناامید اور مایوس نہیں ہونے دیتا۔ وہ اپنے حرکت و عمل سے زندگی کو مسخر کرنے کی جستجو کرتا ہے۔ ڈاکٹر سعادت سعید کے نزدیک ان کے اشعار نا صرف قارئین میں تحرک پیدا کرتے ہیں بل کہ ان کے دلوں میں احساس کی حرارت پیدا کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''اقبال کے اشعار قارئین کے دلوں میں جذبے اور احساس کی حرارت پیدا کرنے کا فریضہ سرانجام دے چکے ہیں اور دے رہے ہیں۔''(6)

ڈاکٹر سعادت سعید کے نزدیک ان کے اشعار ماضی میں بھی قارئین کے دلوں میں حرارت پیدا کرتے رہے اور آج بھی یہ فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ علامہ اقبال نے مولانا جلال الدین رومی کو مرشدِ روحانی تصور کیا اور ان کی طرح جذبہ عشق کو اولیت دی۔ اس جذبے کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے عبدالمجید سالک نے اپنی کتاب "ذکرِ اقبال" میں رقم کرتے ہیں:

''ایک دفعہ علامہ سے سوال کیا گیا: عقل کی انتہا کیا ہے؟ جواب دیا حیرت! سوال کیا گیا: عشق کی انتہا کیا ہے؟ فرمایا عشق کی کوئی انتہا نہیں۔ عشق لاانتہا ہے۔''(7)

اس اقتباس سے واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ اقبال کا تصورِ عشق وسیع معنوں میں استعمال ہوا۔ انسانی نظریات ایک حد تک رہنمائی کرتے ہیں۔ اس کے بعد انسان الہامی نظریات کی جانب رجوع کرتا ہے۔ علامہ اقبال عقل کی انتہا کو حیرت سمجھتے ہیں لیکن ان کے نزدیک عشق کی کوئی انتہا نہیں۔ اسے محدود نہیں کر سکتے۔ یہ زندگی کا بنیادی محرک ہے۔ یہ حرت و عمل کی جانب مائل کرتا ہے تو انسان پرامید زندگی بسر کرتا ہے۔ ان کے اسی جذبے کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''اس لیے ان کی شاعری کو صرف جمالیاتی لذت کے نقطہ نگاہ سے ہی نہیں پڑھنا چاہیے، بلکہ اس حیثیت سے بھی اس پر نظر ڈالنی چاہیے کہ اس کا شاعری کے علاوہ کوئی اور بلند تر اخلاقی اور سیاسی مفہوم بھی ہے۔''(8)

ان کے نزدیک علامہ اقبال کے تصورِ عشق کو محض حظ اٹھانے کے لیے یا جمالیاتی تسکین کے لیے ہی نہیں پڑھنا چاہیے۔ یہ تصور اعلیٰ اخلاقی مفہوم رکھتا ہے۔ یہ سیاسی اعتبار سے بھی قدر و منزلت کا حامل ہے۔ علامہ اقبال کے ہاں ایک مکمل فکری نظام ہے۔ اس کو سمجھا جائے تو ان کے اہم تصورات پڑھنے کو ملتے ہیں۔ ان کے تصورِ عشق کے ساتھ، ان کا تصور خودی اور بے خودی، ان کا تصورِ مردِ مومن اور ان کا تصورِ اجتہاد بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ انسانی آزادی اور انسانی عظمت کے قائل نظر آتے ہیں۔ اس لیے وہ ایک فلاحی ریاست کی بات کرتے ہیں۔ جہاں مذہبی آزادی ہو۔ علامہ اقبال کے اس فکری نظام کو درست سمت میں بیان کرنے کی غرض سے ڈاکٹر وزیر آغا (1922-2010) لکھتے ہیں:

''یہ سعادت ساڑھے چھ سو برس کے بعد شاعرِ مشرق اقبال ہی کے حصے میں آئی کہ اس نے رومی کے فکرِ فلک رس اور اس کی سیرت باصفا کے امتزاج سے ایک پیکرِ بے مثال تیار کیا، پھر اس کے سوزِ عشق سے۔۔۔اسی پیکر کا نام مردِ مومن ہے جس کی فطرت مہر نبوت سے مستنیر اور جس کی نگاہ فرمودہ تقدیر ہے۔''(9)

ڈاکٹر وزیر آغا کے اس اقتباس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ علامہ اقبال مشرقی مفکرین میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے علم کے پیالے کو رنگا رنگ مشروبات سے بھرا۔ اس میں اپنے سے ساڑھے چھ سو برس قبل مولانا رومی جیسے صاحبانِ فکر و عمل سے اکتسابِ فیض کیا۔ اس میں جذبہ عشق اور اپنے حسنِ نظر سے ایسی روح پھونکی کہ مردِ مومن وجود میں آیا۔ جو اپنی دنیا آپ پیدا کرتا ہے۔ اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبال کے ہاں ایک مکمل نظامِ فکر ہے کہ جس میں وہ سیاسی استحکام سے لے کر تہذیبی و ثقافتی شناخت قائم رکھنے کی بات کرتے ہیں۔

موجودہ عہد میں نئی نسل کو علم و ادب کی راغب کرنا اور انھیں اپنی تہذیب و ثقافت سے جوڑے رکھنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ جب نئی نسل اپنے ماضی سے رشتہ جوڑے گی تو اسے کبھی شناخت کا مسئلہ درپیش نہیں ہو گا۔ خوف و ہراس اور مایوسی و بے گانگی آج کے عہد کا المیہ ہے۔ مایوسیاں فروخت کرنے والے ہیں لیکن بدقسمتی سے ان سے خریدار بھی ہیں۔ ایسے میں روشنیوں کے کاروبار کرنے والے ذہن غنیمت ہیں۔ علامہ اقبال کی

فکر ایسی ہمہ گیر اور متنوع ہے جس میں ان مسائل کو حل کرنے تجویز و تدبیر پنہاں ہے۔ ان کے تصورِ عشق کو سمجھ کر اور عمل پیرا ہو کر نئی نسل کائنات کو مسخر کرنے کی جستجو کرے تو نئی دنیائیں پیدا کر سکتا ہے۔ علم و ادب کی دوستی سے اپنی تہذیبی شناخت قائم رکھ سکتا ہے۔ تحمل اور بردباری اپنا کر وہ تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں اپنے مسائل کے حل کی راہ ڈھونڈ سکتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال، لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۱۳ء، ص ۳۷۳

2۔ ایضاً، ص ۲۳۷

3۔ فرمان فتح پوری، اقبال سب کے لیے، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء، ص ۲۵۸

4۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال، لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۱۳ء، ص ۳۱۰

5۔ ایضاً، ۳۵۵۔

6۔ سعادت سعید، اقبال ایک ثقافتی تناظر، لاہور: دستاویز مطبوعات، س۔ن، طبع اول، ص ۹۵

7۔ عبدالمجید سالک، ذکرِ اقبال، جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۶ء، ص ۲۲۳

8۔ سید عبداللہ، ولی سے اقبال تک، لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۲۶۳

9۔ وزیر آغا، تصورات عشق و خرد، اقبال کی نظر میں، لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۵۷